شہر میرے ساتھ چل تو

ندا فاضلی

نئی آواز۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

شہر میرے ساتھ چل تو

ندا فاضلی

نئی آواز۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

شہر میرے ساتھ چل تو

شہر میں سب کو کہاں ملتی ہے رونے کی جگہ
اپنی عزت بھی یہاں ہنسنے ہنسانے سے رہی

شہر میرے ساتھ چل تو

ندا فاضلی

نئی آواز، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

تقسیم کار

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025۔

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ جامع مسجد دہلی۔ 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنس بلڈنگ۔ ممبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ۔ 202002

پہلی بار: دسمبر ۲۰۰۴ء　　تعداد: 1000　　قیمت:-/100 روپے

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی

سخن پروراں یک تے ہیں یک زیاد
ولے ہور ہے منج زباں کا سواد

غواصی

انتساب

اپنی بیٹی تحریر کے نام

بچوں کے چھوٹے ہاتھوں کو چاند ستارے چھونے دو
چار کتابیں پڑھ کر یہ بھی ہم جیسے ہو جائیں گے

فہرست

شہر میرے ساتھ چل تو

ندا فاضلی آج کے دور کے اہم اور معتبر شاعر ہیں۔ وہ ان چند خوش قسمت شاعروں میں ہیں جو کتابوں اور رسالوں سے باہر بھی لوگوں کے حافظوں میں جگمگاتے ہیں۔ ان کی شاعری کی یہ خوبی انھیں ۱۶ ویں صدی کے ان سنت کویوں کے قریب کرتی نظر آتی ہے جن کے کلام کی زمینی قربتوں، روحانی برکتوں اور تصویری عبارتوں کو شروع سے ہی انھوں نے اپنے کلام کے لسانی اظہار کا معیار بنایا ہے۔ اردگرد کے ماحول سے جڑاؤ اور فطری مناظر سے لگاؤ ان کی شعری خصوصیات ہیں۔ رائج روایتی زبان میں مقامی رنگوں کی ہلکی گہری شمولیت سے ندا فاضلی نے جو لب ولہجہ تراشا ہے وہ انھیں سے مخصوص ہے۔ ان کے یہاں شعری زبان نہ چہرے پر داڑھی بڑھاتی ہے نہ ماتھے پر تلک لگاتی ہے۔ یہ وہ زبان ہے جو گلی کوچوں میں بولی جاتی ہے اور گھر آنگن میں کھنکناتی ہے۔ بول چال کے فعلوں میں شعری آہنگ پیدا کرنا ان کی انفرادیت ہے۔

اب سے پہلے کے چار شعری مجموعے (۱) لفظوں کا پل ۱۹۷۱ء (۲) مور ناچ ۱۹۷۸ء (۳) آنکھ اور خواب کے درمیاں ۱۹۸۶ء (۴) کھویا ہوا سا کچھ ۱۹۹۸ء شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ لفظوں کا پل سے کھویا ہوا سا کچھ (اس کتاب پر انھیں ساہتیہ اکادمی کے انعام سے بھی نوازا گیا ہے) تک ان کی ہر کتاب کے کئی کئی ایڈیشن آچکے ہیں۔ ندا فاضلی نثر و نظم دونوں میں عوام و خواص کے پسندیدہ نام ہیں۔ ان کی اس مقبولیت میں انسانی اعلا اقدار پر

ان کے اعتماد کے ساتھ ہم عصر عالمی معاشرہ سے ان کی باخبر وابستگی کا بھی حصہ ہے۔ وہ فن اور زندگی کی زمینی ہم رشتگی کے قائل ہیں۔ وہ کسی فلسفہ یا نظریہ کے بجائے اپنے دیکھے ہوئے یا انفرادی سطح پر محسوس کیے ہوئے کو اپنا موضوع بناتے ہیں اور اسی لیے دوسروں سے مختلف نظر آتے ہیں۔

ندا کا تعلق اردو شاعروں کی اس نسل سے ہے جس کی آمد کی آہٹیں ۶۰۔۶۵ء کے درمیان سنائی دینے لگی تھیں لیکن ان کی شاعری کا بہ غور مطالعہ کیا جائے تو لگتا ہے اس نسل سے ندا کا رشتہ محض زمانی ہے کیونکہ اس دور کی احاطہ بندی جن تنقیدی بنیادوں پر کی جاتی رہی ہے ان کا مجموعی ادبی رویہ کسی لحاظ سے بھی ان کے دائرہ میں نہیں آتا۔ وہ بے معنویت کی تشہیر کے دور میں سماجی معنویت کے شاعر ہیں۔ وہ لسانی توڑ پھوڑ کے زمانہ میں لب ولہجہ کی غنائیت کے پرستار ہیں۔ ان کی شاعری، گھر رشتے اور معاشرہ کی تثلیث کا بیان ہے۔ سماجی تضادات کے شعوری کے باوجود زندگی سے محبت کی جو شدت ندا کے لفظوں سے جھانکتی ہے وہ انھیں اس ادبی روایت سے جوڑتی ہے جو کبیر، نظیر اور وہٹ مین سے ہوتی ہوئی تیسری دنیا کے مسائلی ادب تک پہنچتی ہے۔ ان کی ناراضگی میں فریفتگی کا حسن نمایاں ہے۔ ''شہر میرے ساتھ چل تو'' ندا فاضلی کی شاعری کی پانچویں کتاب ہے۔ ان کی یہ کتاب بھی پچھلی کتابوں کی طرح مسلسل بدلتے منظروں کا البم ہے۔ اس میں ان کی فکری ترجیحات کا رقبہ پہلے سے زیادہ وسیع اور گہرا ہے۔ ندا کا تعلق زندگی کے ساتھ مسافرانہ جیسا ہے۔

یہ جو پھیلا ہوا زمانہ ہے
اس کا رقبہ غریب خانہ ہے
کوئی منظر سدا نہیں رہتا
ہر تعلق مسافرانہ ہے

یہ درست ہے کہ وہ کس مقام پر دیر تک نہیں ٹھہرتے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے وہ جہاں بھی جتنی دیر تک ہوتے ہیں وہاں اپنے پورے حواس وشدت کے ساتھ اپنی حاضری درج کرتے ہیں اور عمل وقول کے فاصلہ کو کم کر کے، لفظ کو پر تاثیر بناتے

ہیں اور یہ ہی ان کے کلام کی اثر پذیری کا راز بھی ہے۔ وہ ہر منظر کو اپنی نظر سے دیکھتے ہیں اور وہ انھیں جیسا دکھائی دیتا ہے۔ اسے ویسا ہی بیان کرتے ہیں۔ زندگی اور اس کی تعداد کے بارے میں ان کا رویہ شخصی ہے۔

جس سے جب تک ملے دل ہی سے ملے، دل جو بدلا تو فسانہ بدلا
رسم دنیا کو نبھانے کے لیے ہم سے رشتوں کی تجارت نہ ہوئی

ندا نے اپنی اس کتاب کے ذریعے نئے سرے سے اپنا تعارف کرایا ہے۔ سماجی سروکار کے لحاظ سے بھی اور ان کے اظہار کے پیرایوں کی سطح پر بھی۔ اس مجموعے میں مقابلتہً غزلوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ان غزلوں میں موضوعات اور الفاظ۔ دونوں لحاظ سے ندا دوسروں سے مختلف ہیں۔ اس مجموعے میں خاص طور سے وہ نظمیں جو انھوں نے اپنی بیٹی تحریر کے لیے کہی ہیں۔ اس مجموعہ کی ہی اچھی نظمیں نہیں ہے اردو کی اچھی تخلیقات میں بھی ان کا شمار کیا جاسکتا ہے۔ ''شہر میرے ساتھ چل تو'' میں غزلوں، گیتوں، دوہوں اور نظموں کے ساتھ اچھی خاصی تعداد ماہیے کی بھی ہے۔ ان میں بھی دوہوں کی طرح ندا کے انداز و الفاظ کی تازہ کاری متوجہ کرتی ہے۔

پاگل ہے مراقی ہے
زندہ ہے نہ مردہ
یہ بچہ عراقی ہے

ندا فاضلی چلتی پھرتی لیکن لمحہ بہ لمحہ بدلتی زندگی کے شاعر ہیں۔ ان کا کلام محض خیال آرائی یا کتابی فلسفہ طرازی نہیں ہے۔ وجودی مفکر و ادیب کامیو نے کہا ہے۔ میرے آگے نہ چلو، میں تمھاری پیروی نہیں کرسکتا۔ میرے پیچھے نہ چلو میں رہنمائی نہیں کرسکتا۔ میرے ساتھ چلو...... دوست کی طرح۔

کامیو کی یہ بات ندا کے ادبی رویہ پر صادق آتی ہے۔ ان کی شاعری قاری اساس شاعری ہے۔ اس میں بہت جلد دوست بن جانے کی صلاحیت ہے۔ اس میں نہ ناصحانہ بلند آہنگی ہے، نہ باغیانہ تیور ہیں۔ انھوں نے لفظوں کے ذریعے جو دنیا بسائی ہے وہ سیدھی یا

یک رخی نہیں ہے۔ اس کے کئی چہرے ہیں۔ یہ کہیں مسکراتی ہے کہیں جھلاتی ہے۔ کہیں پرندہ بن کے چہچہاتی ہے اور کہیں بچہ بن کر مسکراتی ہے۔ انھیں کے ساتھ جنگ کی تباہ کاری بھی ہے۔ سیاست کی عیاری بھی ہے۔ ان سارے مناظر کو انھوں نے ہمدردانہ آنکھوں سے دیکھا ہے اور دوست کی طرح بیان کیا ہے۔

ندا کی تخلیقی ذہانت کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے۔ انسان اور فطرت کی عدم توازن کو جو آج عالمی تشویش کا مسئلہ ہے۔ ندا نے نہایت دردمندی کے ساتھ موضوع سخن بنایا ہے۔ جس دور میں بڑھتی ہوئی آبادی کے ردعمل میں، بستیوں سے پرندے رخصت ہو رہے ہوں۔ جنگلوں سے پیڑ اور جانور غائب ہو رہے ہوں، سمندروں کو پیچھے ہٹا کر عمارتیں بنائی جارہی ہوں۔ اس دور میں فطرت کی معصوم فضائیت اور اس کی شناخت کے آہستہ آہستہ ختم ہونے کی افسردگی نے ان کی انفرادیت میں ایک اور نہج کا اضافہ کیا ہے۔

سنا ہے اپنے گاؤں میں رہا نہ اب وہ نیم
جس کے آگے ماند تھے سارے وید حکیم

(ادارہ)

شہر میرے ساتھ چل تو

شہر میرے ساتھ چل تو
چیختے، لڑتے، جھگڑتے
کرفیو
نعروں
کے اس بازار سے باہر نکل تو
تیری آنکھوں میں
بھری ہے ریت
لگتا ہے کئی برسوں سے
تو سویا نہیں ہے
ہڈیوں میں تیری
تیرے سوچنے، محسوس کرنے کا تھا
جتنا فاسفورس
مر چکا ہے
کوکوکولا، پیپسی کا رنگ
ان میں بھر چکا ہے
اب کسی بھی حادثے پر
واقعے پر

مسئلے پر
چونکتا ہے تو
نہ روتا ہے کبھی تو
جب بھی دیکھو
مورچے، جلسے، تماشے
سچ بتا
تنہا بھی ہوتا ہے کبھی تو؟
فربہی کا جان لیوا روگ
تیرے تن بدن کو کھا رہا ہے
شہر تو............
چاروں طرف سے
پھیلتا ہی پھیلتا ہی جا رہا ہے
اس سے پہلے
گیس کے غبارے جیسا
تو اچانک پھٹ کے
ٹکڑا ٹکڑا بکھرے
شہر سن ایسا کریں ہم
دور جنگل کے کسی خاموش سے گوشے میں چھپ کر
پیاز کی گانٹھوں کو
چاقو سے تراشیں ——— اور روئیں
روتے روتے شانت ہو کر ——— ایک گہری نیند سوئیں
خوب گہری نیند سوئیں

کیمرے کے سامنے

واہ کیا بات ہے
اتنی لمبی ہنسی!
اور وہ بھی
حسیں، دلنشیں
یقیں جانیے
ایسے ہنستے ہیں آپ
جیسے جھوٹے ہیں سب
ایک سچے ہیں آپ
''شکریہ!!
یہ بتائیں یہاں سے، ہے جانا کہاں؟''
دور ٹیلے کے آگے
وہاں
لاش اک نوجواں کی پڑی ہے جہاں
بھیڑ سہمی ہوئی سی
کھڑی ہے جہاں

یہ تو سب ٹھیک ہے
یہ بتائیں وہاں
مجھ کو کرنا ہے کیا؟
لاش کو دیکھ کر
پھر سے ہنسنا ہے کیا؟
جی نہیں!!
اُس جگہ
پھوٹ کے روئیے اس طرح
اپنے ہی گھر میں ہو
سانحہ جس طرح
کیمرے کا یہ سنسار ہے
ہر ڈیزائن کی پوشاک تیار ہے
جھوٹ کو جو کرے پیش سچ کی طرح
وہ ہی فنکار ہے

گیت

(مدر ٹریسا کے لیے)

ہر دھوپ میں چھاؤں سی

ہر سر پہ دعاؤں سی

روتی ہوئی آنکھوں کی

تحریر جو پڑھتی تھی

انسان کی خاطر جو

بھگوان سے لڑتی تھی

وہ پیاسی زمینوں پر

اتری تھی گھٹاؤں سی

بیماروں کے بستر پر

سوتا تھا خدا اس کا

لاچاروں کے چہروں سے

روتا تھا خدا اس کا

روشن تھی اندھیروں میں
وہ ماں کی دعاؤں سی
وہ پیاس کے مندر میں
برسات کی مورت تھی
وہ بھوک کی مسجد میں
روٹی کی عبادت میں
وہ درد کے گرجا میں
انسان کی خدمت تھی
نفرت کی جفاؤں میں
رحمت کی وفاؤں سی

ہر سر پہ..............

کل اور آج

پہلے ایسا
کب ہوتا تھا
اجیارا ہو یا اندھیارا
جب ہونا ہو تب ہوتا تھا
ایک ہی دن
چلتا تھا ہفتوں
خواب تھے چھوٹے
رات بڑی تھی
وقت!
نکلتا تھا کم باہر
جیب کے اندر
جیب گھڑی تھی

آنکھ اٹھی
اور منظر بدلے
یہ کیسا..........!
جنجال نیا ہے
پچھلا سال
گیا تھا کل ہی
آج جو دیکھا
سال نیا ہے
پہلے ایسا کب ہوتا تھا

غزل

بندرابن کے کرشن کنہیاؔ اللہ ہُو
بنسی، رادھا، گیتا، گیاؔ، اللہ ہُو

تھوڑے تنکے، تھوڑے دانے، تھوڑا جل
ایک ہی جیسی ہر گوریاؔ اللہ ہُو

جیسا جس کا برتن ویسا اس کا تن
گھٹتی، بڑھتی، گنگا میاؔ اللہ ہُو

ایک ہی دریا نیلا پیلا لال ہرا
اپنی اپنی سب کی نیاّ اللہ ہُو

مولویوں کا سجدہ، پنڈت کی پوجا
مزدوروں کی ہیاّ ہیاّ اللہ ہُو

غزل

(صدام حسین کے لیے)

اُس کو کھو دینے کا احساس تو کم باقی ہے
جو ہوا وہ نہ ہوا ہوتا، یہ غم باقی ہے

اب نہ وہ چھت ہے نہ وہ زینہ، نہ انگور کی بیل
صرف اک اس کو بھلانے کی قسم باقی ہے

میں نے پوچھا تھا سبب پیڑ کے گر جانے کا
اٹھ کے مالی نے کہا اُس کی قلم باقی ہے

جنگ کے فیصلے میداں میں کہاں ہوتے ہیں
جب تلک حافظے باقی ہیں علَم باقی ہے

تھک کے گرتا ہے ہرن صرف شکاری کے لیے
جسم-گھائل ہے مگر آنکھوں میں رم باقی ہے

تھوڑی سی کمی رہ جاتی ہے

ہر کویتا مکمل ہوتی ہے
لیکن وہ قلم سے کاغذ پر
جب آتی ہے
تھوڑی سی کمی رہ جاتی ہے

ہر پریت مکمل ہوتی ہے
لیکن وہ گگن سے دھرتی پر
جب آتی ہے
تھوڑی سی کمی رہ جاتی ہے

ہر جیت مکمل ہوتی ہے
سرحد سے وہ لیکن آنگن میں
جب آتی ہے
تھوڑی سی کمی رہ جاتی ہے

پھر کویتا نئی
پھر پریت نئی
پھر جیت نئی...... بہلاتی ہے
ہر بار
مگر لگتا ہے یوں ہی
تھوڑی سی کمی رہ جاتی ہے

غزل

ہر ایک گھر میں دیا بھی جلے اناج بھی ہو
اگر نہ ہو کہیں ایسا تو احتجاج بھی ہو

رہے گی وعدوں میں کب تک اسیر خوشحالی
ہر ایک بار ہی کل کیوں، کبھی تو آج بھی ہو

نہ کرتے شور شرابہ تو اور کیا کرتے
تمھارے شہر میں کچھ اور کام کاج بھی ہو

حکومتوں کو بدلنا تو کچھ محال نہیں
حکومتیں جو بدلتا ہے وہ سماج بھی ہو

بدل رہے ہیں کئی آدمی درندوں میں
مرض پرانا ہے اس کا نیا علاج بھی ہو

اکیلے غم سے نئی شاعری نہیں ہوتی
زبان میر میں غالب کا امتزاج بھی ہو

غزل

آتی جاتی ہر محبت ہے چلو یوں ہی سہی
جب تلک ہے خوبصورت ہے چلو یوں ہی سہی

ہم کہاں کے دیوتا ہیں بے وفا وہ ہیں تو کیا
گھر میں کوئی گھر کی زینت ہے چلو یوں ہی سہی

وہ نہیں تو کوئی تو ہوگا کہیں اس کی طرح
جسم میں جب تک حرارت ہے چلو یوں ہی سہی

میلے ہو جاتے ہیں رشتے بھی لباسوں کی طرح
دوستی ہر دن کی محنت ہے چلو یوں ہی سہی

بھول تھی اپنی، فرشتہ آدمی میں ڈھونڈنا
آدمی میں آدمیت ہے چلو یوں ہی سہی

جیسی ہونی چاہیے تھی ویسی تو دنیا نہیں
دنیا داری بھی ضرورت ہے چلو یوں ہی سہی

غزل

کٹھ پتلی ہے یا جیون ہے جیتے جاؤ سوچو مت
سوچ سے ہی ساری الجھن ہے جیتے جاؤ سوچو مت

لکھا ہوا کردار کہانی میں ہی چلتا پھرتا ہے
کبھی ہے دوری کبھی ملن ہے جیتے جاؤ سوچو مت

ناچ سکو تو ناچو جب تھک جاؤ تو آرام کرو
ٹیڑھا کیوں گھر کا آنگن ہے جیتے جاؤ سوچو مت

ہر مذہب کا ایک ہی کہنا، جیسا مالک رکھّے رہنا
جب تک سانسوں کا بندھن ہے جیتے جاؤ سوچو مت

گھوم رہے ہیں بازاروں میں، سرمایوں کے آتش دان
کس بھٹی میں کون ایندھن ہے جیتے جاؤ سوچو مت

گیت

بادل میرے گاؤں بھی آؤ
پگڑی ٹانگو
پیپل نیچے
اونٹ بٹھاؤ
مسجد پیچھے
سوکھ رہے ہیں تال تلاؤ
پھر ان کو بھر جاؤ
بادل میرے گاؤں بھی آؤ
چوپالوں میں کتھا سناؤ
پنجرے کی مینا سے بولو
بنیا ڈنڈی مار رہا ہے
دال نمک
اچھے سے تولو
کھول کے اپنی مہنگی گٹھری
سستی ہاٹ لگاؤ
بادل..............

نیم کی میٹھی کرو نبولی
سلگاؤ ٹھنڈے چولہوں کو
میدانوں سے دھوپ اٹھا کر
پینگیں بھرنے دو جھولوں کو

چپ چپ ہیں
بیجوں میں انکُر
آلہا اُودل گاؤ

بادل میرے......

پگڈنڈی پر گھاس بچھاؤ
دودھ چڑھاؤ گائے کے تھن میں
پھاڑ کے کھیا کے کھاتے کو
چین لکھو گھر کے آنگن میں

پیاسی ہے
ندیا بے چاری
شیتل جل برساؤ

بادل میرے گاؤ بھی آؤ

غزل

جتنی بُری کہی جاتی ہے اتنی بُری نہیں ہے دنیا
بچوں کے اسکول میں شاید تم سے ملی نہیں ہے دنیا

چار گھروں کے ایک محلے کے باہر بھی ہے آبادی
جیسی تمھیں دکھائی دی ہے سب کی وہی نہیں ہے دنیا

گھر میں ہی مت اسے سجاؤ، اِدھر اُدھر بھی لے کے جاؤ
یوں لگتا ہے جیسے تم سے اب تک کُھلی نہیں ہے دنیا

بھاگ رہی ہے گیند کے پیچھے، جاگ رہی ہے چاند کے نیچے
شور بھرے کالے نعروں سے اب تک ڈری نہیں ہے دنیا

غزل

کوئی کسی سے خوش ہو اور وہ بھی بار ہا ہو
یہ بات تو غلط ہے
رشتہ لباس بن کر میلا نہیں ہوا ہو
یہ بات تو غلط ہے
وہ چاند رہگزر کا، ساتھی جو تھا سفر
تھا معجزہ نظر کا
ہر بار کی نظر سے روشن وہ معجزہ ہو
یہ بات تو غلط ہے

ہے بات اس کی اچھی، لگتی ہے دل کو سچی
پھر بھی ہے تھوڑی کچی
جو اس کا حادثہ ہے میرا بھی تجربہ ہو
یہ بات تو غلط ہے

دریا ہے بہتا پانی، ہر موج ہے روانی
رکتی نہیں کہانی
جتنا لکھا گیا ہے اتنا ہی واقعہ ہو
یہ بات تو غلط ہے

یہ یگ ہے کاروباری، ہر شے اشتہاری
راجہ ہو یا بھکاری
شہرت ہے جس کی جتنی اتنا ہی مرتبہ ہو
یہ بات تو غلط ہے

زمیں پہ لیکن ابھی ہیں آنسو

یہیں کہیں
وہ چراغ بھی تھا
کھلی ہواؤں میں
جو ستارے سا ڈولتا تھا

یہیں کہیں
وہ درخت بھی تھا
جو آیتوں کی زباں میں
موسم سے بولتا تھا

یہیں کہیں
وہ خیال بھی تھا
جو وقت کی ڈوریوں کی
گانٹھوں کو کھولتا تھا

یہ سچ ہے
اب وہ نہیں ہیں
لیکن مجھے یقیں ہے
جو مدتوں سے ہیں لاپتہ
یہیں کہیں ہیں

وہ سب کتابیں
سراغ روشن تھے جن میں
ان کے............
زمین سے آسماں کو
واپس چلی گئی ہیں
جہاں سے اتری تھیں
اب وہیں پر
وہ چاند سورج بنی ہوئی ہیں
زمیں پہ لیکن
ابھی ہیں بچے
زمیں پہ لیکن
ابھی ہیں مائیں
زمیں پہ لیکن
ابھی ہیں آنسو

انھیں کی چنچل شرارتوں میں
انھیں کی بے لوث چاہتوں میں
انھیں کی مجبور زحمتوں میں
وہ حرف شامل ہیں
جن میں چھپ کر
جو گمشدہ ہے
وہ جھانکتا ہے

جانے والے گئے ہیں کہاں
چاند سورج گھٹا ہو گئے

کالا امبر پیلی دھرتی یا اللہ
ہا ہا ، ہے، ہے، ہی ہی ہی ہی یا اللہ

کرگل اور کشمیر ہی تیرے نام ہوں کیوں
بھائی بہن محبوبہ بیٹی یا اللہ

پیر پیمبر کو اب اور نہ زحمت دے
چولہا، چکی، روٹی، سبزی یا اللہ

شہر میرے ساتھ چل تو

گھی مصری بھی بھیج کبھی اخباروں میں
کئی دنوں سے چائے ہے کڑوی یا اللہ

تو ہی پھول، ستارا، ساون، ہریالی
اور کبھی تو ناگا ساکی یا اللہ

غزل

یہ جو پھیلا ہوا زمانہ ہے
اس کا رقبہ غریب خانہ ہے

کوئی منظر سدا نہیں رہتا
ہر تعلق مسافرانہ ہے

دیس پردیس کیا پرندوں کا
آب و دانہ ہی آشیانہ ہے

کیسی مسجد کہاں کا بت خانہ
ہر جگہ اس کا آستانہ

عشق کی عمر کم ہی ہوتی ہے
باقی جو کچھ ہے دوستانہ ہے

جو ہوا وہ ہوا کس لیے
ہوگیا تو گلہ کس لیے

کتابوں کی دوکان

یہ رستہ ہے وہی
تم کہہ رہے ہو
یہاں تو......
پہلے جیسا کچھ نہیں ہے۔
درختوں پر
نہ وہ چالاک بندر
شرارت کرتے رہتے تھے جو اکثر
نہ طاقوں میں
چھپے صوفی کبوتر
غٹرغوں کرتے رہتے تھے جو دن بھر
نہ کڑوا نیم
املی کے ابرابر
جو گھر گھر گھومتا تھا
وید بن کر

کئی دن بعد
تم آئے ہو شاید!!
یہ سورج چاند والا
بوڑھا امبر
بدل دیتا ہے چہرہ ہو
یا منظر
یہ عالی شان ہوٹل ہے جہاں پر
یہاں پہلے
کتابوں کی دکاں تھی!!!

غزل

گرجا میں، مندروں میں، اذانوں میں بٹ گیا
ہوتے ہی صبح آدمی خانوں میں بٹ گیا

اک۔عشق نام کا جو پرندہ خلا میں تھا
اترا جو شہر میں تو دوکانوں میں بٹ گیا

پہلے تلاشا کھیت، پھر دریا کی کھوج کی
باقی کا وقت گیہوں کے دانوں میں بٹ گیا

جب تک تھا آسمان میں سورج سبھی کا تھا
پھر یوں ہوا وہ چند مکانوں میں بٹ گیا

ہیں تاک میں شکاری، نشانہ ہیں بستاں
عالم تمام چند مچانوں میں بٹ گیا

خبروں نے کی مصوری، خبریں غزل بنیں
زندہ لہو تو تیر کمانوں میں بٹ گیا

میرا شہر

یہ ہی شہر
جو اب
سمندر کنارے
بنا چھاؤں کے ناریل کے سہارے
جھکائے ہوئے سر کو بیٹھا ہوا ہے
اکیلا سا

چپ چپ سا
سہما ہوا ہے
کبھی یہ بھی
چاروں طرف بھاگتا تھا
بڑا زندہ دل تھا
یہ راتوں میں
دن کی طرح جاگتا تھا
کبھی جینز پہنے
جوانوں کے جیسا
کبھی چلتی لوکل میں
گانوں کے جیسا

کبھی آرتی اور
اذانوں کے جیسا
کبھی دور کے
آسمانوں کے جیسا
صدا اس کی
ہر خواب میں گونجتی تھی
کھنکتا ہوا ایسا کلدار تھا وہ
شرابی
جواری
بھکاری
پجاری
خود اپنی ہی مستی میں سرشار تھا وہ
نظر لگ گئی اس کو شاید کسی کی
یہ بادل سا گھر گھر
برستا بہت تھا
کبھی اس کی جیبوں میں
ڈھیروں ہنسی تھی
یہ ہنستا بہت تھا

غزل

ہرایک بات کو چپ چاپ کیوں سنا جائے
کبھی تو حوصلہ کرکے نہیں کہا جائے

تمھارا گھر بھی اسی شہر کے حصار میں ہے
لگی ہے آگ کہاں، کیوں؟ پتہ کیا جائے

جدا ہے ہیر سے رانجھا کئی زمانوں سے
نئے سرے سے کہانی کو پھر لکھا جائے

کہا گیا ہے ستاروں کو چھونا مشکل ہے
کتنا سچ ہے کبھی تجربہ کیا جائے

کتابیں یوں تو بہت سی ہیں میرے بارے میں
کبھی اکیلے میں خود کو بھی پڑھ لیا جائے

کام تو ہیں زمیں پر بہت
آسماں پر خدا کس لیے؟

غزل

وقت بنجارا صفت لمحہ بہ لمحہ اپنا
کس کو معلوم ! یہاں کون ہے کتنا اپنا

جو بھی چاہے وہ بنالے اسے اپنے جیسا
کسی آئینہ کا ہوتا نہیں چہرہ اپنا

خود سے ملنے کا چلن عام نہیں ہے ورنہ
اپنے اندر ہی چھپا ہوتا ہے رستہ اپنا

یوں بھی ہوتا ہے وہ خوبی جو ہے ہم سے منسوب
اس کے ہونے میں نہیں ہوتا ارادہ اپنا

خط کے آخر میں سبھی یوں ہی رقم کرتے ہیں
اس نے رسماً ہی لکھا ہوگا تمھارا اپنا

نشہ نشے کے لیے ہے عذاب میں شامل
کسی کی یاد کو کیجیے شراب میں شامل

اتفاق

ندی، پہاڑ
پیڑ، پھل
ہوا
چراغ
پھول
جل
یہ میرا آج
تیرا کل
یہاں ہے جو بھی
جس طرح
وہ ایک اتفاق ہے
اس اتفاق میں
کسی کا دخل ہے نہ روپ ہے
جو چھاؤں ہے تو چھاؤں ہے
جو دھو ہے تو دھوپ ہے

ببول!

کیوں ببول ہے

پتہ نہیں

گلاب

کیوں گلاب ہے

پتہ نہیں!

انار

کیوں انار ہے

پتہ نہیں!

پتہ نہیں ہے جس کا

وہ ہی وجہِ افتراق ہے

مگر یہ فرق

جو ہمارے بیچ کا نفاق ہے

یہ ہی کبھی وصال ہے

یہ ہی کبھی فراق ہے

غزل

نزدیکیوں میں دور کا منظر تلاش کر
جو ہاتھ میں نہیں ہے وہ پتھر تلاش کر

سورج کے ارد گرد بھٹکنے سے فائدہ
دریا ہوا ہے گم تو سمندر تلاش کر

تاریخ میں محل بھی ہے حاکم بھی تخت بھی
گم نام جو ہوئے ہیں وہ لشکر تلاش کر

رہتا نہیں ہے کچھ بھی یہاں ایک سا سدا
دروازہ گھر کا کھول کے پھر گھر تلاش کر

کوشس بھی کر، امید بھی رکھ، راستہ بھی چن
پھر اس کے بعد تھوڑا مقدر تلاش کر

کبھی کبھی کا یہ مل بیٹھنا غنیمت ہے
نئی لغت کے مطابق یہی محبت ہے

غزل

یقین چاند پہ سورج میں اعتبار بھی رکھ
مگر نگاہ میں تھوڑا سا انتظار بھی رکھ

خدا کے ہاتھ میں مت سونپ سارے کاموں کو
بدلتے وقت پہ کچھ اپنا اختیار بھی رکھ

یہ ہی لہو ہے شہادت یہ ہی لہو پانی
خزاں نصیب سہی ذہن میں بہار بھی رکھ

گھروں کے طاقوں میں گلدستے یوں نہیں سجتے
جہاں ہیں پھول وہیں آس پاس خار بھی رکھ

پہاڑ گونجیں، ندی گائے یہ ضروری ہے
سفر کہیں کا ہو، دل میں کسی کا پیار بھی رکھ

اپنی بیٹی تحریر کے لیے

تین نظمیں

جیسے لکھتا ہے سورج

وہ آئی!
اور اس نے مسکرا کے
میری بڑھتی عمر کے
سارے پرانے
جانے انجانے برس
پہلے ہواؤں میں اڑائے
اور پھر میری زباں کے
سارے لفظوں کو
غزل کو
گیت کو
دوہوں کو
نظموں کو
کھلی کھڑکی سے باہر پھینک کر
یوں کِھل کھلائی
قلم نے
میز پر لیٹے ہی لیٹے آنکھ مچکائی

میاؤں کر کے کودی
بند شیشی میں پڑی سیاہی
اٹھا کے ہاتھ دونوں
چائے کے کپ نے لی انگڑائی
چھلانگیں مارے کے
ہنسنے لگی برسوں کی تنہائی

اچانک میرے ہونٹوں پر
اشاروں اور بے معنی صداؤں کی
وہی بھاشا اُبھر آئی

جسے لکھتا ہے سورج
جسے پڑھتا ہے دریا
جسے سنتا ہے سبزہ

جسے صدیوں بادل بولتا ہے
اور ہر دھرتی سمجھتی ہے

مرمت کی ضرورت

بہت میلا ہے یہ سورج
کسی دریا کے پانی میں۔
اسے دھو کر سکھائیں پھر
گگن میں چاند بھی!
کچھ دھندلا دھندلا ہے
مٹا کے اس کے سارے داغ دھبے
جگمگائیں پھر
ہوائیں سو رہی ہیں
پربتوں پر پاؤں پھیلائے
جگا کے ان کو نیچے لائیں
پیڑوں میں بسائیں پھر۔

دھماکے کچی نیندوں میں
ڈرادیتے ہیں بچوں کو
دھماکے ختم کر کے
لوریوں کو گنگنائیں پھر

وہ جب سے ساتھ ہے
یوں لگ رہا ہے
اپنی یہ دنیا

جو صدیوں کی وراثت ہے
جو ہم سب کی امانت ہے
پرانی ہو گئی ہے
اس میں اب
تھوڑی مرمّت کی ضرورت ہے

چھوٹی سی شاپنگ

گوٹے والی
لال اوڑھنی
اس پر
چولی گھاگرا
اسی سے میچنگ کرنے والا
چھوٹا سا اک ناگرا

چھوٹی سی!
یہ شاپنگ تھی،
یا!
کوئی جادو ٹونا
لمبا چوڑا شہر اچانک
بن کر
ایک کھلونا

اتہاسوں کا جال توڑ کے
داڑھی
پگڑی
اونٹ چھوڑ کے

الف سے
اماں
بے سے
بابا
بیٹھا باچ رہا تھا
پانچ سال کی بچی
بن کر بے پور
ناچ رہا تھا

غزل

کسی بھی شہر میں جاؤ کہیں قیام کرو
کوئی فضا کوئی منظر کسی کے نام کرو

دعا سلام ضروری ہے شہر والوں سے
مگر اکیلے میں اپنا بھی احترام کرو

ہمیشہ امن نہیں ہوتا فاختاؤں میں
کبھی کبھار عقابوں سے بھی کلام کرو

ہر ایک بستی بدلتی ہے رنگ روپ کئی
جہاں بھی صبح گزارو، ادھر ہی شام کرو

خدا کے حکم سے شیطان بھی ہے آدم بھی
وہ اپنا کام کرے گا تم اپنا کام کرو

غزل

کوئی نہیں ہے آنے والا پھر بھی کوئی آنے کو ہے
آتے جاتے رات اور دن میں کچھ تو جی بہلانے کو ہے

چلو یہاں سے اپنی اپنی شاخوں پہ لوٹ آئے پرندے
بھولی بسری یادوں کو پھر تنہائی دہرانے کو ہے

دو دروازے ایک حویلی، آمد رخصت ایک پہیلی
کوئی جا کر آنے کو ہے، کوئی آ کر جانے کو ہے

دن بھر کا ہنگامہ سارا، شام ڈھلے پھر بستر پیارا
میرا رستہ ہو یا تیرا، ہر رستہ گھر جانے کو ہے

آبادی کا شور شرابہ، چھوڑ کے ڈھونڈو کوئی خرابہ
تنہائی پھر شمع جلا کر کوئی حرف سنانے کو ہے

دوہے

ندیا اوپر پل بنا، جُڑا نگر سے گاؤں
چڑیاں گونگی ہوگئیں، اندھی ہوگئی چھاؤں

توتا، مینا، فاختہ، لاکھ مچائیں شور
جس کے پر پیسوں بھرے نام اسی کا مور

یہ بھی، وہ بھی اور بھی ایک سے سب کے روگ
بلا رہی ہیں وستوئیں، بھاگ رہے ہیں لوگ

دوہے

تالا، چابی، چٹخنی، دروازہ، دیوار
ایک دوجے کے خوف سے، بنا ہے یہ سنسار

اب مل میں کس کام کے، بنکر ماتا دین
سو چرخوں کی روئی کو، کاتے ایک مشین

سندر پھول گلاب کا، یوں بگیا سے جائے
مرجھانے کے بعد بھی، کلیوں میں مسکائے

گیت

جھپا جھپ!
پیپل لہرایا
شہر میں مجھ سے ملنے
میرا گاؤں چلا آیا

گرم دوپہری
آنگن بیٹھی
پان سپاری کھائے
برکھا!
پھٹی پرانی چھتری
میں پیوند لگائے
بھیج نبی جی
مٹھو بولا
مینڈک ٹرّایا
جھپا جھپ پیپل لہرایا
شہر میں مجھ سے ملنے
میرا گاؤں چلا آیا

سات پیالوں کے
رنگوں سے
دھنک بنے دوپٹے
چھن چھن کرتے ہاتھوں سے
سنگیت بھرتے سل بٹے

پوسٹ مین کا گا
چھجے پر
سندیسہ لایا

چھپا چھپ
پیپل لہرایا
شہر میں مجھ سے ملنے
میرا گاؤں
چلا آیا

جنریشن گیپ

صبح جب
اخبار نے مجھ سے کہا
زندگی..........!
جینا بہت دشوار
سرحدیں
پھر شور غل کرنے لگیں
جنگ لڑنے کے لیے تیار ہے
درمیاں تھا
جو خدا
وہ اب کہاں
آدمی سے آدمی بے زار ہے

پاس آکر
ایک بچّے نے کہا
آپ کے ہاتھوں میں جو اخبار ہے
اس میں
میلے کا نیا بازار ہے
ہاتھی
گھوڑا
شیر
سب ہونگے وہاں
ایسے دن!
ہر روز آتے ہیں کہاں
ہاف ڈے ہے آج
کل اتوار ہے

غزل

جب بھی کسی نے خود کو صدا دی
سناٹوں میں آگ لگا دی

مٹی اس کی، پانی اس کا
جیسی چاہی شکل بنا دی

چھوٹا لگتا تھا افسانہ
میں نے تیری بات بڑھا دی

جب بھی سوچا اس کا چہرہ
اپنی ہی تصویر بنادی

تجھ کو، تجھ میں ڈھونڈ کے ہم نے
دنیا تیری شان بڑھادی

غزل

جو ہو اک بار وہ ہر بار ہو ایسا نہیں ہوتا
ہمیشہ ایک ہی سے پیار ہو ایسا نہیں ہوتا

ہر اک کشتی کا اپنا تجربہ ہوتا ہے دریا میں
سفر میں روز ہی منجدھار ہو ایسا نہیں ہوتا

کہانی میں تو کرداروں کو جو چاہے بنا دیجیے
حقیقت بھی کہانی کار ہو ایسا نہیں ہوتا

کہیں تو کوئی ہوگا جس کو اپنی بھی ضرورت ہو
ہر اک بازی میں دل کی ہار ہو ایسا نہیں ہوتا

سکھا دیتی ہیں چلنا ٹھوکریں بھی راہ گیروں کو
کوئی رستہ سدا دشوار ہو ایسا نہیں ہوتا

غزل

چاہتیں موسمی پرندے ہیں، رت بدلتے ہی لوٹ جاتے ہیں
گھونسلے بن کے ٹوٹ جاتے ہیں داغ شاخوں پہ چہچہاتے ہیں

آنے والے بیاض میں اپنی، جانے والوں کے نام لکھتے ہیں
سب ہی اوروں کے خالی کمروں کو، اپنی اپنی طرح سجاتے ہیں

موت اک واہمہ ہے نظروں کا، ساتھ چھٹتا کہاں ہے اپنوں کا
جو زمیں پر نظر نہیں آتے، چاند تاروں میں جگمگاتے ہیں

یہ مصور عجیب ہوتے ہیں، آپ اپنے جیب ہوتے ہیں
دوسروں کی شباہتیں لے کر، اپنی تصویر ہی بناتے ہیں

یوں ہی چلتا ہے کاروبار جہاں، ہے ضروری ہر ایک چیز یہاں
جن درختوں میں پھل نہیں آتے وہ جلانے کے کام آتے ہیں

پہلی چنگاری

وہ پہلی چنگاری
جوزمین پر
ہوا کے ہاتھوں سے
پتھروں میں ہوئی تھی روشن
بجھی نہیں ہے

لہک رہی ہے
وہ پھول بن کر

دہک رہی ہے
وہ آگ بن کر

لہک رہی ہے
وہ راگ بن کر

غزل

نہ جانے کون سا منظر نظر میں رہتا ہے
تمام عمر مسافر سفر میں رہتا ہے

لڑائی دیکھے ہوئے دشمنوں سے ممکن ہے
مگر وہ خوف! جو دیوار و در میں رہتا ہے

خدا تو مالک و مختار ہے کہیں بھی رہے
کبھی بشر میں کبھی جانور میں رہتا ہے

عجیب دور ہے یہ، طے شدہ نہیں کچھ بھی
نہ چاند شب میں نہ سورج سحر میں رہتا ہے

جو ملنا چاہو تو مجھ سے ملو کہیں باہر
وہ کوئی اور ہے جو میرے گھر میں رہتا ہے

بدلنا چاہو تو دنیا بدل بھی سکتی ہے
عجیب فتور سا ہر وقت سر میں رہتا ہے

جنگل کا سفر

اک جنگل میں
ہاتھی جیسے
اک بادل کے نیچے
بیٹھا تھا
اک بے چہرہ سا
جوگی آنکھیں میچے
دیکھ کے مجھ کو
اس نے پوچھا
جانا کہاں ہے تجھ کو؟
اپنے سفر کا
نقشہ!
میں نے اسے دکھایا جب سے
سانپ لپیٹے
وہ ہی جوگی
ساتھ ہے میرے تب سے

دن بھر تو وہ
میرے آگے
یا پیچھے ہوتا ہے
رات ہوتے ہی
یوں ہوتا ہے
اپنے باہر جاگتا ہوں میں
وہ!
مجھ میں سوتا ہے

غزل

کچھ دنوں تو شہر سارا اجنبی سا ہوگیا
پھر ہوا یوں، وہ کسی کی، میں کسی کا ہوگیا

عشق کرکے دیکھیے، اپنا تو یہ ہے تجربہ
گھر ،محلہ، شہر سب پہلے سے اچھا ہوگیا

قبر میں حق گوئی باہر منقبت قوالیاں
آدمی کا آدمی ہونا تماشہ ہوگیا

وہ ہی مورت، وہ ہی صورت، وہ ہی قدرت کی طرح
اس کو جس نے جیسا سوچا وہ بھی ویسا ہوگیا

غزل

ایک ہی دھرتی ہم سب کا گھر جتنا تیرا اتنا میرا
دکھ سکھ کا یہ جنتر منتر جتنا تیرا اتنا میرا

گیہوں چاول بانٹنے والے، جھوٹا تولیں تو کیا بولیں
یوں تو سب کچھ اندر باہر جتنا تیرا اتنا میرا

ہر جیون کی وہی وراثت، آنسو، سپنا، چاہت، محنت
سانسوں کا ہر بوجھ برابر، جتنا تیرا اتنا میرا

سانسیں جتنی، موجیں اتنی، سب کی اپنی اپنی گنتی
صدیوں کا اتہاس سمندر، جتنا تیرا اتنا میرا

خوشیوں کے بٹوارے تک ہی اونچے نیچے آگے پیچھے
دنیا کے مٹ جانے کا ڈر، جتنا تیرا اُتنا میرا

ہجرت

ضروری کاغذوں کی فائلوں سے
بے ضروری
کاغذوں کو
چھانٹا جاتا ہے
کبھی کچھ پھینکا جاتا ہے
کبھی کچھ بانٹا جاتا ہے۔
کئی برسوں کے رشتوں کو
پلوں میں
کاٹا جاتا ہے
وہ شیشہ ہو
کہ پتھر ہو
بنا دُم کا وہ بندر ہو
نشانوں سے بھرا
یا کوئی بوسیدہ کلنڈر ہو
پرانے گھر کے طاقوں میں
مچانوں میں
وہ سب!!
چھوٹا ہوا اپنا

کبھی بن کر کوئی آنسو
کبھی بن کر کوئی سپنا
اچانک
جمگاتا ہے
وہ سب کھویا ہوا
اپنے نہ ہونے سے ستاتا ہے
مکانوں کے بدلنے سے
نئے خانوں میں ڈھلنے سے
بہت کچھ ٹوٹ جاتا ہے
بہت کچھ چھوٹ جاتا ہے

مٹھی بھر لوگوں کے ہاتھوں میں لاکھوں کی تقدیریں ہیں
جدا جدا ہیں دھرم علاقے ایک سی لیکن زنجیریں ہیں

آج اور کل کی بات نہیں ہے صدیوں کی تاریخ یہ ہی ہے
ہر آنگن میں خواب ہیں لیکن چند گھروں میں تعبیریں ہیں

جب بھی کوئی تخت سجا ہے، میرا تیرا خون بہا ہے
درباروں کی شان و شوکت میدانوں کی شمشیریں ہیں

ہر جنگل کی ایک کہانی، وہ ہی بھینٹ وہی قربانی
گونگی بہری ساری بھیڑیں چرواہوں کی جاگیریں ہیں

دو شعر

جانے کیا ان کی نگاہوں نے کہا ہے ہم سے
آج کل شہر میں ہر کوئی خفا ہے ہم سے

کاش وہ ایک نہیں ہوتے بہت سے ہوتے
جن کو وہ مل نہ سکے، ان کو گلا ہے ہم سے

غزل

آج ذرا فرصت پائی تھی آج اسے پھر یاد کیا
بند گلی کے آخری گھر کو کھول کے پھر آباد کیا

کھول کے کھڑکی چاند ہنسا پھر چاند نے دونوں ہاتھوں سے
رنگ اڑائے، پھول کھلائے، چڑیوں کو آزاد کیا

بڑے بڑے غم کھڑے ہوئے تھے رستہ روکے راہوں میں
چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے ہی ہم نے دل کو شاد کیا

بات بہت معمولی سی تھی الجھ گئی تکراروں میں
ایک ذرا سی ضد نے آخر دونوں کو برباد کیا

داناؤں کی بات نہ مانی کام آئی نادانی ہی
سنا ہوا کو، پڑھا ندی کو، موسم کو استاد کیا

ماہیے

پاگل ہے مراقی ہے
مردہ ہے نہ زندہ
یہ بچہ عراقی ہے

ڈالی پہ پرندہ ہے
آنکھوں میں بھر لیجیے
منظر ابھی زندہ ہے

ست رنگی دوپٹہ ہے
دیکھے جو نہ مڑ کے
وہ اُلو کا پٹھا ہے

حق گوئی کا حامی ہے
نالاں ہیں سب اس سے
آئینہ حرامی ہے

بے نام سا مرقد ہے
مٹی ہوئی مٹی
اب جنگ نہ سرحد ہے

اللہ کہاں ہے تو؟
پھر بھی جہاں تو ہے
کیا سچ ہے وہاں ہے تو؟

کیا خوب زمانہ ہے
جتنی حقیقت ہے
اتنا ہی فسانہ ہے

چھجے پر کبوتر ہے
دھوپ میں ہے قاصد
حجرے میں قلندر ہے

تالے میں لگی چابی
بھیا کی تھالی میں
گڑ رکھنے لگی بھابی

سُر بنسی کا لہرایا
رادھا کی گاگر میں
پھر چاند اتر آیا

ہردوار پہ میلا ہے
دوار کے پیچھے تو
ہر کوئی اکیلا ہے

تندور میں روٹی ہے
بھوک اُدھر ہی ہے
داڑھی ہے نہ چوٹی ہے

مُردہ گھر میں بٹوارا

ساری لاشیں
ایک سی تھیں
وہ ہی آنکھیں — میری جیسی
وہ ہی ٹانگیں — تیری جیسی
سارے بچے بچوں جیسے
سارے بوڑھے بوڑھے جیسے
ساری لاشیں
چپ تھیں لیکن
مردہ گھر کے چاروں جانب
شوروغل تھا
زندگی کے تاجروں کا
موت کے سوداگروں کا
گدیوں کا کرسیوں کا
بندیوں میں
چوٹیوں میں

داڑھیوں میں
ناف سے نیچے کی
ننگی جھاڑیوں میں
زندگی کو جس طرح
ٹکڑوں میں بانٹا جا رہا تھا
موت کو بھی......
ذات اور دھرموں سے۔
چھانٹا جا رہا تھا
کون کس کا؟
کس کے کتنے؟
غم تو غم ہے
زعفرانی کیا، ہرا کیا؟
میرے ماتم میں
وہاں جتنے بھی تھے
انسان تھے وہ
ٹوٹا پھوٹا
میرا ہندستان تھے وہ

ایک دن اور

نیند کے گہرے اندھیرے
غار سے پھر
روشنی پھوٹی

سجا آکاش
رستے جگمگائے
اوس میں بھیگی
ہوا کی آہٹوں سے
آشیانوں میں
پرندے چہچہائے

پھر ملی
بے نور آنکھوں کو بصارت
پھر ملی
بے صوت کانوں کو سماعت

پھر ملی

بے جان سانسوں کو حرارت
کھول کر کھڑکی
موذن کی صدا پر
زندگی نے
اک نیا سپنا لکھا ہے
پھر نئی دنیا بسی ہے
پھر نیا سورج اگا ہے
ایک دن
پھر اور جینے کو ملا ہے

کنفیشن

(مہاراشٹر کی شیلا کنی کے لیے جو اکیلی ظلم سے لڑ کے ہار گئی)

یہ سچ ہے
جب تمھارے جسم کی
چادر
بھری محفل میں کھینچی جا رہی تھی
اس تماشہ کا
تماشائی تھا میں بھی
اور میں چپ تھا

یہ سچ ہے
جب تمھاری بے گناہی کو
سر بازار سولی پر چڑھایا جا رہا تھا
اس گھڑی
میں بھی وہاں تھا
اور میں چپ تھا

یہ سچ ہے
جب سلگتی ریت پر تم
سر برہنہ
اپنے بیٹوں
بھائیوں کو
تنہا بیٹھی
رو رہی تھیں
میں تمھاری بے بسی کا
آئینہ تھا
اور میں چپ تھا

یہ سچ ہے
آج بھی جب
شیر، چیتوں سے گھرے جنگل سے ٹکراتی
تمھاری چیختی سانسیں
مجھے آواز دیتی ہیں
میری شہرت
مری عزت
مرے آرام کی عادت
مرے بڑھتے ہوئے قدموں کو

بڑھ کے تھام لیتی ہیں

میں مجرم تھا۔ میں مجرم ہوں

مری خاموشی مرے جرم کی زندہ شہادت ہے

میں ان کے ساتھ تھا جو

ظلم کو ایجاد کرتے ہیں

میں ان کے ساتھ ہوں

جو ہنستی گاتی بستیاں برباد کرتے ہیں

غزل

میں اپنے اختیار میں ہوں بھی نہیں بھی ہوں
دنیا کے کاروبار میں ہوں بھی نہیں بھی ہوں

تیری ہی جستجو میں، لگا ہے کبھی کبھی
میں تیرے انتظار میں ہوں بھی نہیں بھی ہوں

فہرست مرنے والوں کی قاتل کے پاس ہے
میں اپنے ہی مزار میں ہوں بھی نہیں بھی ہوں

اوروں کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں
اک میں ہی اس دیار میں ہوں بھی نہیں بھی ہوں

مجھ سے ہی ہے ہر ایک سیاست کا اعتبار
پھر بھی کسی شمار میں ہوں بھی نہیں بھی ہوں

پیشہ ور

نہیں!
یہ بھوکا نہیں ہے
اس پر ترس نہ کھاؤ
فقیر اس کو نہ جانو
یہ کوئی پیشہ ور ہے
یہ ایکٹر ہے
جو جھوٹے افلاس کا
تماشہ دکھا رہا ہے
لکھے ہوئے دوسروں کے جملے
سنا رہا ہے
بدن میں!
جب بھوک جاگتی ہے
ہر ایک سرحد
ہر ایک سیما پھلانگتی ہے
یہ ہاتھ پھیلا کے
گڑگڑاتی نہیں ہے
حق اپنا مانگتی ہے

یہ بھوک تو آگ ہے
دھواں ہے
یہ کوئی ٹھہری ہوئی اکائی کہاں ہے
پیہم رواں دواں ہے
یہ ہر زمیں ہے
یہ ہر زباں ہے
جہاں بھی ہے
ایک کارواں ہے

باغ کی تلاش

تلاش تھی جو باغ کی
روانگی سے پیشتر
اگر نہ تھی تمھیں خبر
تو چلتے پانیوں کی
سنسناہٹوں سے پوچھتے
کدھر ہے وہ؟
یہ خامشی کی آہٹوں سے پوچھتے
چہکتے پنچھیوں کی
گنگناہٹوں سے پوچھتے

ادھر تو

دور دور تک

نہ رنگ ہے

نہ پھول ہے

کبھی نہ ختم ہونے والی

رہگزر کی دھول ہے

کتاب گھر کے راستے سے

باغ کی تلاش

بے اصول ہے

ننگا ناچ

کھیت ان کے پاس کب تھے
جن میں وہ غلّہ اُگاتے
روئی چرخوں میں کہاں تھی
جس سے وہ کپڑا بناتے
آگ چولھوں میں کہاں تھی
جس پہ وہ روٹی پکاتے
ہاتھ وہ
بے کام تھے سب
جن کو کاموں سے لگایا جا رہا تھا
گودیاں ماؤں کی
قبریں بن رہی تھیں
مکتبوں میں
خوں بہایا جا رہا تھا

موت رستوں پر بچھائی جا رہی تھی
شہر کو زندہ جلایا جا رہا تھا
ہو رہی تھی!
تختِ شاہی کی مرمت!
سبز پیڑوں کو گرایا جا رہا تھا
آیتوں کی برکتوں میں
آرتی کے منتروں میں
صدیوں بوڑھی......
بھوک کو
ننگا نچایا جا رہا تھا

معاہدہ

کٹی پھٹی ہیں دھرتیاں
دھواں دھواں فضائیں ہیں
لہولہو
عبادتیں ہیں
بے اثر دعائیں ہیں
وہ جنگلوں کے پہریدار
جانور نہیں رہے
سنبھالتے تھے موسموں کو
جو شجر نہیں رہے
اداس گھونسلے ہیں
ان کے نغمہ گر نہیں رہے
سمندروں کی وسعتوں کو
پی رہی ہیں بستیاں
عمارتوں میں چن رہی ہیں
پربتوں کی چوٹیاں

ہر ایک ندی کو تیاگ کر
جلاوطن ہیں دیویاں
ہوائیں تیز گام ہیں
خلائیں بے لگام ہیں
معاہدہ!
فلک سے جو زمیں کا تھا
نہیں رہا
دلوں کے آس پاس تھا جو راستہ
نہیں رہا
کسی سے اب کسی کا کوئی رابطہ
نہیں رہا

نیند پورے بستر میں نہیں ہوتی

نیند پورے بستر میں نہیں ہوتی
وہ پلنگ کے ایک کونے میں
دائیں
یا بائیں
کسی مخصوص تکیے کی
توڑ موڑ میں چھپی ہوتی ہے
جب تکیے اور گردن میں
سمجھوتہ ہو جاتا ہے
تو آدمی چین سے
سو جاتا ہے

دل ترازو

بھاگتی صبحیں
جاگتیں راتیں
بے خبر راہی
لاپتہ راہیں
جسم سے دور
جسم کی ٹانگیں
اپنی بینائی سے
جدا آنکھیں
دل ترازو
دماغ بیوپاری
منہ کے اندر
زبان بازاری

بے ضرورت

ضرورتوں کا شمار

آدمی آدمی کا

کاروبار

ہر طرف

شور کر رہی ہے مشین

گھر میں

بازار بن رہی زمین

یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی آس پاس ہے
وہ کون ہے جو ہے بھی نہیں اور اداس ہے

ممکن ہے لکھنے والے کو بھی یہ خبر نہ ہو
قصے میں جو نہیں ہے وہی بات خاص ہے

مانے نہ مانے کوئی حقیقت تو ہے یہ ہی
چرخہ ہے جس کے پاس اُسی کی کپاس ہے

اتنا بھی بن سنور کے نہ نکلا کرے کوئی
لگتا ہے ہر لباس میں وہ بے لباس ہے

چھوٹا بڑا ہے پانی خود اپنے حساب سے
اتنی ہی ہر ندی ہے یہاں جتنی پیاس ہے

تعجب روشن ہے

جو شکل بھی سامنے آتی ہے
کچھ غائب ہے کچھ حاضر
اتنا ہی نظر سے اوجھل ہے
جتنا آنکھوں میں ظاہر ہے
یہ دھرتی چلتی رہتی ہے
رفتار بدلتی رہتی ہے
جب دیکھو-کوئی اور ہی شے
ہر شے سے نکلتی رہتی ہے
ہر دیکھے ہوئے میں پوشیدہ
جو ان دیکھا ہے کتنا ہے
دیکھو جو اگر تو کچھ بھی نہیں
سوچو تو یہ جیون جتنا ہے
ہر لمحہ تعجب روشن ہے
رخصت حیرانی نہیں ہوئی
صدیوں بوڑھے آکاش تلے
یہ زمیں پرانی نہیں ہوئی